سعادت حسن منٹو

ولادت: ۱۹۱۲ء

وفات: ۱۹۵۵ء

سعادت حسن منٹو موضع سمبرالا (لدھیانہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ غلام حسن تھا۔ منٹو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ منٹو کا تعلیمی ریکارڈ کچھ زیادہ اچھا نہ تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اُردو میں اکثر فیل ہوتے تھے۔ منٹو کو زمانہ طالب علمی سے ہی ادب سے دلچسپی تھی۔ اُنھوں نے ادبی زندگی کا آغاز غیر ملکی کہانیوں کے تراجم سے کیا لیکن جلد ہی وہ تخلیقی کہانیاں لکھنے لگے۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور فلموں کے لیے کہانیاں لکھ کر پیسے کماتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ بمبئی سے لاہور منتقل ہوگئے۔ منٹو کی آخری عمر بڑی کسمپرسی کی حالت میں گزری۔

منٹو اُردو ادب کا ایک اہم اور متنازعہ افسانہ نگار ہے۔ نقاد اُنھیں ترقی پسند کہتے ہیں لیکن ترقی پسند اُنھیں قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ وہ انسانی زندگی اور اس کی نفسیات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اُنھوں نے کھردری حقیقت کو بے رحمی سے موضوع بنایا اور قارئین کو چونکایا۔ وہ ایک حساس طبع اور باریک مشاہدے کا فنکار تھا۔ منٹو کی تصانیف اور تخلیقات مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔

تصانیف: آتش پارے، منٹو کے افسانے، دھواں، لذتِ سنگ، چغد، ٹھنڈا گوشت، یزید، نمرود کی خُدائی، بادشاہت کا خاتمہ وغیرہ۔

منظور

جب اسے ہسپتال میں داخل کیا گیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ پہلی رات اسے آکسیجن پر رکھا گیا۔ جونز ڈیوٹی پر تھی، اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مریض صبح سے پہلے پہلے مرجائے گا۔ اس کی نبض کی رفتار غیر یقینی تھی۔ کبھی زور زور سے پھڑ پھڑاتی اور کبھی لمبے لمبے وقفوں کے بعد چلتی تھی۔

پسینے میں اس کا بدن شرابور تھا، ایک لحظے کے لیے بھی اسے چین نہیں ملتا تھا۔ کبھی اس کروٹ لیٹتا، کبھی اس کروٹ۔ جب گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ جاتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتا اور لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ رنگ اس کا ہلدی کی گانٹھ کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں۔ ناک کا بانسا برف کی ڈلی۔ سارے بدن پر رعشہ تھا۔

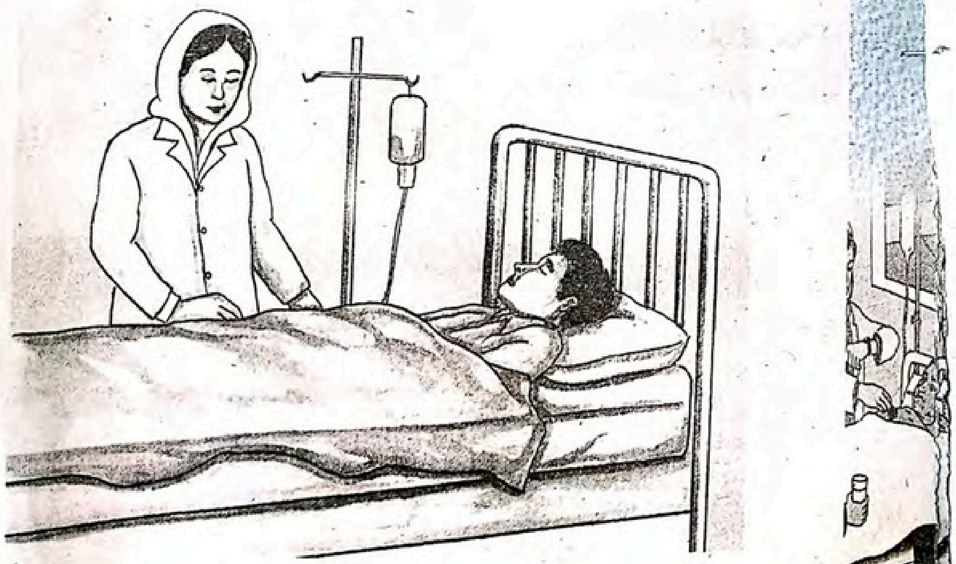

ساری رات اس نے بڑے شدید کرب میں کاٹی۔ اوکسیجن برابر دی جا رہی تھی، صبح ہوئی تو اسے کسی قدر افاقہ ہوا اور وہ نڈھال ہو کر سو گیا۔

اس کے دو تین عزیز آئے۔ کچھ دیر بیٹھے رہے اور چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے انہیں بتا دیا تھا کہ مریض کو دل کا عارضہ ہے جسے ''کورونری تھرومبوسس'' کہتے ہیں۔ یہ بہت مہلک ہوتا ہے۔

جب وہ اٹھا تو اسے ٹیکے لگا دیے گئے۔ اس کے دل میں بدستور میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ شانوں کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے۔ جیسے رات بھر انہیں کوئی کوٹتا رہا تھا۔ جسم کی بوٹی بوٹی دکھ رہی تھی مگر نقاہت کے باعث وہ بہت زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ویسے اس کو یقین تھا کہ اس کی موت دور نہیں، آج نہیں تو کل ضرور مر جائے گا۔

اس کی عمر بتیس برس کے قریب تھی۔ ان برسوں میں اس نے کوئی راحت نہیں دیکھی تھی جو اس وقت اسے یاد آتی اور اس کی صعوبت میں اضافہ کرتی۔ اس کے ماں باپ اس کو بچپن ہی سے داغ مفارقت دے گئے تھے۔ معلوم نہیں اس کی پرورش کس خاص شخص نے کی تھی۔ بس وہ ایسے ہی ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھاتا، اس عمر تک پہنچ گیا تھا اور ایک کارخانے میں ملازم ہو کر پچیس روپے ماہوار پر انتہا درجے کی افلاس زدہ زندگی گزار رہا تھا۔

دل میں ٹیسیں نہ اٹھتیں تو وہ اپنی تندرستی اور بیماری میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہ کرتا کیونکہ صحت اس کی کبھی بھی اچھی نہیں تھی۔ کوئی نہ کوئی عارضہ اسے ضرور لاحق رہتا تھا۔

شام تک اسے چار ٹیکے لگ چکے تھے۔ اوکسیجن ہٹا لی گئی تھی۔ دل کا درد کسی قدر کم تھا، اس لیے وہ ہوش میں تھا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے سکتا تھا۔

وہ بہت بڑے وارڈ میں تھا جس میں اس کی طرح اور کئی مریض لوہے کی چارپائیوں پر لیٹے تھے سیں اپنے کام میں مشغول تھیں۔ اس کے داہنے ہاتھ نو دس برس کا لڑکا کمبل میں لپٹا ہوا اس کی طرف دیکھ ہا تھا، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''السلام علیکم''۔ لڑکے نے بڑے پیار سے کہا۔

نئے مریض نے اس کے پیار بھرے لہجے سے متاثر ہو کر جواب دیا۔ ''وعلیکم السلام''۔ لڑکے نے کمبل میں کروٹ بدلی: بھائی جان! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے''۔ نئے مریض نے اختصار سے کہا: اللہ کا شکر ہے۔

لڑکے کا چہرہ اور زیادہ تمتما اٹھا۔ ''آپ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کا نام کیا ہے''۔

''میرا نام''! نئے مریض نے مسکرا کر لڑکے کی طرف برادرانہ شفقت سے دیکھا۔

''میرا نام اختر ہے''۔

''میرا نام منظور ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے یک دم کروٹ بدلی اور اس نرس کو پکارا جو ادھر سے گزر رہی تھی۔

''آپا.................. آپا جان''۔

نرس رک گئی۔ منظور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا۔ نرس قریب آئی اور اسے پیار کر کے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسسٹنٹ ہاؤس سرجن آیا۔ منظور نے اس کو بھی سلام کیا۔ ''ڈاکٹر جی، السلام علیکم''۔

ڈاکٹر سلام کا جواب دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے باتیں کرتا رہا جو ہسپتال کے بارے میں تھیں۔

منظور کو اپنے وارڈ کے ہر مریض سے دلچسپی تھی۔ اس کو معلوم تھا کس کی حالت اچھی ہے اور کس کی حالت خراب ہے، کون گیا ہے سب نرسیں اس کی بہنیں تھیں اور سب ڈاکٹر اس کے دوست۔ مریضوں میں کوئی چچا تھا، کوئی ماموں اور کوئی بھائی۔

سب اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی شکل و صورت معمولی تھی۔ مگر اس میں غیر معمولی کشش تھی۔ ہر وقت اس کے چہرے پر تمتماہٹ رہتی جو اس کی معصومیت پر ہالے کا کام دیتی تھی۔ وہ ہر وقت خوش رہتا تھا۔ بہت زیادہ باتونی تھا، مگر اختر کو، حالانکہ وہ دل کا مریض تھا اور اس مرض کے باعث بہت چڑ چڑا ہوگیا

تھا، اس کی یہ عادت کھلتی نہیں تھی۔

چونکہ اس کا بستر اختر کے بستر کے پاس تھا، اس لیے وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس سے گفتگو شروع کر دیتا تھا جو چھوٹے چھوٹے معصوم جملوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

'' بھائی جان! آپ کے بھائی بہن ہیں؟''

'' میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہوں''۔

'' آپ کے دل میں اب درد تو نہیں ہوتا ہے''۔

'' آپ ٹھیک ہوجائیں گے............دودھ زیادہ پیا کریں!''

'' میں بڑے ڈاکٹر جی سے کہوں گا، وہ آپ کو مکھن بھی دیا کریں گے''۔

بڑا ڈاکٹر بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ صبح جب راؤنڈ پر آتا تو کرسی منگا کر اس کے پاس تھوڑی دیر تک ضرور بیٹھتا اور اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا۔

اس کا باپ درزی تھا۔ دوپہر کو پندرہ بیس منٹ کے لیے آتا۔ سخت افراتفری کے عالم میں اس کے لیے پھل وغیرہ لاتا اور جلدی جلدی اسے کھلا کر اور اس کے سر پر محبت کا ہاتھ پھیر کر چلا جاتا۔ شام کو اس کی ماں آتی اور برقع اوڑھے دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہتی۔

اختر نے اسی وقت اس سے دلی رشتہ قائم کر لیا تھا، جب اس کو سلام کیا تھا۔ اس سے باتیں کرنے کے بعد یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہوگیا۔ دوسرے دن رات کی خاموشی میں جب اسے سوچنے کا موقع ملا تو اس نے محسوس کیا۔ اس کو جو افاقہ ہوا ہے، منظور ہی کا معجزہ ہے۔

ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ وہ صرف چند گھڑیوں کا مہمان تھا۔ منظور نے اس کو بتایا تھا کہ جب اسے بستر پر لٹایا گیا تھا تو اس کی نبض قریب قریب غائب تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کئی مرتبہ دعا مانگی تھی کہ خدا اس پر رحم کرے۔ یہ اس کی دعا ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ مرتے مرتے بچ گیا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گا، اس لیے کہ اس کا مرض بہت مہلک تھا۔ بہرحال اب اس کے دل میں اتنی

خواہش ضرور پیدا ہوگئی تھی کہ وہ کچھ دن زندہ رہے تاکہ منظور سے اس کا رشتہ فوراً نہ ٹوٹ جائے۔

دو تین دن گزر گئے۔ منظور حسبِ معمول سارا دن چہکتا رہتا تھا۔ کبھی نرسوں سے باتیں کرتا کبھی ڈاکٹروں سے، کبھی جمعداروں سے۔ یہ بھی اس کے دوست تھے۔ اختر کو تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وارڈ کی بدبودار فضا کا ہر ذرہ اس کا دوست ہے۔ وہ جس شے کی طرف دیکھتا تھا، فوراً اس کی دوست بن جاتی تھی۔

دو تین روز گزرنے کے بعد جب اختر کو معلوم ہوا کہ منظور کا نچلا دھڑ مفلوج ہے تو اسے سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن اس کو حیرت بھی ہوئی کہ اتنے بڑے نقصان کے باوجود وہ خوش کیونکر رہتا ہے۔ باتیں جب اس کے منہ سے بلبلوں کی مانند نکلتی تھیں تو انہیں سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ گوشت پوست کا بے جان لوتھڑا ہے۔

اختر نے اس سے اس کے فالج کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اس لیے کہ اس سے ایسی بات کے متعلق پوچھنا بہت بڑی حماقت ہوتی جس سے وہ قطعاً بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اسے کسی ذریعے سے معلوم ہوگیا کہ منظور ایک دن جب کھیل کود کو واپس آیا تو اس نے ٹھنڈے پانی سے نہا لیا جس کے باعث ایک دم اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہوگیا۔

ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا، انہیں بہت دکھ ہوا۔ شروع شروع میں حکیموں سے علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر ٹونے ٹوٹکوں کا سہارا لیا مگر بے سود۔ آخر کسی کے کہنے پر اُنھوں نے اسے ہسپتال میں داخل کر دیا تاکہ باقاعدگی سے اس کا علاج ہوتا رہے۔

ڈاکٹر مایوس تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کے جسم کا مفلوج حصہ کبھی درست نہ ہوگا مگر پھر بھی اس کے والدین کا جی رکھنے کے لیے وہ اس کا علاج کر رہے تھے۔ انہیں حیرت تھی کہ وہ اتنی دیر زندہ کیسے رہا ہے۔ اس لیے کہ اس پر فالج کا حملہ بہت شدید تھا، جس نے اس کے جسم کا نچلا حصہ بالکل ناکارہ کرنے کے سوا اس کے بدن کے بہت سے نازک اعضا جھنجھوڑ کر رکھ دیے تھے۔ وہ اس پر ترس کھاتے تھے اور اسے پیار کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس نے سدا خوش رہنے کا گُر اپنی اس شدید علالت سے سیکھا تھا۔ اس کے معصوم

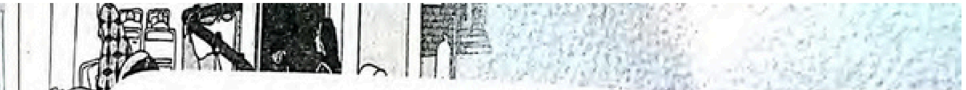

ماغ نے یہ طریقہ خود ایجاد کیا تھا کہ اس کا دکھ دب جائے۔

اختر پر پھر ایک دورہ پڑا۔ یہ پہلے دورے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک تھا مگر اس نے صبر اور تحمل سے کام لیا اور منظور کی مثال سامنے رکھ کر اپنے درد سے غافل رہنے کی کوشش کی جس میں اسے کامیابی ہوئی۔ ڈاکٹروں کو اس مرتبہ تو سو فیصد یقین تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی، مگر معجزہ رونما ہوا اور رات کی ڈیوٹی پر مُعین نرس نے صبح سویرے اسے دوسری نرسوں کے سپرد کیا تو اس کی گرتی ہوئی نبض سنبھل چکی تھی..........وہ زندہ تھا۔

موت سے کشتی لڑتے لڑتے نڈھال ہو کر جب وہ سونے لگا تو اس نے نیم مُندی ہوئی آنکھوں سے منظور کی طرف دیکھا جو محوِ خواب تھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اختر نے اپنے کمزور و نحیف دل میں اس کی پیشانی کو چوما اور سو گیا۔

جب اٹھا تو منظور چہک رہا تھا۔ اس کے متعلق ایک نرس سے کہہ رہا تھا۔ "آپا اختر بھائی جان کو جگاؤ۔ دوا کا وقت ہو گیا ہے"۔

"سونے دو..........اسے آرام کی ضرورت ہے"۔

"نہیں..........وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ انہیں دوا دیجیے"۔

"اچھا دے دوں گی"۔

منظور نے جب اختر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے بہت خوش ہو کر بآوازِ بلند کہا:

"السلام علیکم"۔

اختر نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا: "وعلیکم السلام"۔

"بھائی جان! آپ بہت سوئے"۔

"ہاں..........شاید"۔

NOT FOR SALE

"نرس آپ کے لیے دوا لا رہی ہے"۔

اختر نے محسوس کیا کہ منظور کی باتیں اس کے نحیف دل کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ خود اسی کی طرح چہکنے چہکارنے لگا۔ اس نے منظور سے پوچھا: "اس مرتبہ بھی تم نے میرے لیے دعا مانگی تھی"؟

منظور نے جواب دیا۔ "نہیں"۔

"کیوں؟"

"میں روز روز دعائیں نہیں مانگا کرتا..........ایک دفعہ مانگ لی، کافی تھی۔ مجھے معلوم تھا آپ ٹھیک ہو جائیں گے"۔ اس کے لہجے میں یقین تھا۔

اختر نے اسے ذرا سا چھیڑنے کے لیے کہا: "تم دوسروں سے کہتے رہتے ہو کہ ٹھیک ہو جاؤ گے، خود کیوں نہیں ٹھیک ہو کر گھر چلے جاتے"۔

منظور نے تھوڑی دیر سوچا" میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بڑے ڈاکٹر جی کہتے تھے کہ تم ایک مہینے تک چلنے پھرنے لگو گے..........دیکھیں نا اب میں نیچے اور اوپر کھسک سکتا ہوں"۔

اس نے کمبل میں اوپر نیچے کھسکنے کی ناکام کوشش کی۔ اختر نے فوراً کہا: واہ منظور میاں واہ..........ایک مہینا کیا ہے.......... یوں گزر جائے گا۔

منظور نے چٹکی بجائی اور خوش ہو کر ہنسنے لگا۔

ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ اس دوران اختر پر دل کے دو تین دورے پڑے جو زیادہ شدید نہیں تھے۔ اب اس کی حالت بہتر تھی، نقاہت دور ہو رہی تھی۔ اعصاب میں پہلا سا تناؤ بھی نہیں تھا۔ دل کی رفتار ٹھیک تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے۔ لیکن ان کا تعجب بدستور قائم تھا کہ وہ بچ کیسے گیا۔

اختر دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے بچانے والا کون ہے۔ وہ کوئی انجکشن نہیں تھا۔

NOT FOR SALE

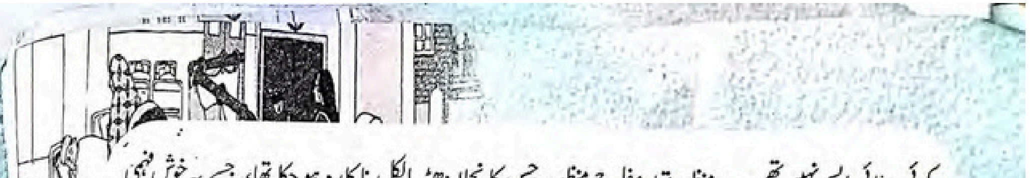

کوئی دوائی ایسی نہیں تھی۔ وہ منظور تھا، مفلوج منظور، جس کا نچلا دھڑ بالکل ناکارہ ہو چکا تھا، جسے یہ خوش فہمی تھی کہ اس کے گوشت پوست کے بے جان لوتھڑے میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

اختر اور منظور کی دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ منظور کی ذات اس کی نظروں میں مسیحا کا رتبہ رکھتی تھی کہ اس نے اس کو دوبارہ زندگی عطا کی تھی اور اس کے دل و دماغ سے وہ تمام کالے بادل ہٹا دیئے تھے۔ جن کے سائے میں وہ اتنی دیر تک گھٹی گھٹی زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ اس کی قنوطیت، رجائیت میں تبدیل ہوگئی تھی، اسے زندہ رہنے سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بالکل ٹھیک ہو کر ہسپتال سے نکلے اور ایک صحت مند زندگی بسر کرنی شروع کردے۔

اسے بڑی الجھن ہوتی تھی جب وہ دیکھتا تھا کہ منظور ویسے کا ویسا ہے۔ اس کے جسم کے مفلوج حصے پر ہر روز مالش ہوتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا تھا، اس کی خوش رہنے والی طبیعت شگفتہ سے شگفتہ تر ہو رہی تھی۔ یہ بات حیرت اور الجھن کا باعث تھی۔

ایک دن بڑے ڈاکٹر نے منظور کے باپ سے کہا کہ اب وہ اسے گھر لے جائے کیونکہ اس کا علاج نہیں ہوسکتا۔

منظور کو صرف اتنا پتہ چلا کہ اب اس کا علاج ہسپتال کے بجائے گھر پر ہوگا اور بہت جلد ٹھیک ہوجائے گا۔ مگر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اختر نے جب اس سے پوچھا کہ وہ ہسپتال میں کیوں رہنا چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”وہاں اکیلا رہوں گا۔ ابا دکان پر جاتا ہے، ماں ہمسائی کے ہاں جا کر کپڑے سیتی ہے، میں وہاں کس سے کھیلا کروں گا، کس سے باتیں کروں گا“؟

اختر نے بڑے پیار سے کہا: ”تم اچھے جو ہوجاؤ گے منظور میاں۔ چند دن کی بات ہے پھر تم باہر اپنے دوستوں سے کھیلا کرنا۔ اسکول جایا کرنا“۔

”نہیں نہیں۔“ منظور نے کمبل سے اپنا سدا تمتمانے والا چہرہ ڈھانپ کر رونا شروع کردیا۔ اختر کو بہت دکھ ہوا۔ دیر تک وہ اسے چمکارتا پچکارتا رہا۔

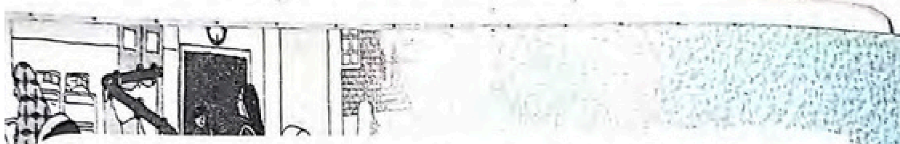

آخر اس کی آواز گلے میں رندھ گئی اور اس نے کروٹ بدل لی۔

شام کو ہاؤس سرجن نے اختر کو بتایا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب نے اس کی ریلیز کا آرڈر دے دیا ہے۔ وہ صبح جاسکتا ہے۔ منظور نے سنا تو بہت خوش ہوا۔

اس نے اتنی باتیں کیں، اتنی باتیں کیں کہ تھک گیا۔ ہر نرس کو، ہر اسٹوڈنٹ کو، ہر جمعدار کو اس نے بتایا کہ بھائی جان اختر جا رہے ہیں۔

رات کو بھی وہ اختر سے دیر تک خوشی سے بھرپور ننھی ننھی معصوم باتیں کرتا رہا۔ آخر سوگیا۔ اختر جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ منظور کب تک ٹھیک ہوگا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی دوا موجود نہیں جو اس پیارے سے بچے کو تندرست کردے۔ اس نے اس کی صحت کے لیے صدقِ دل سے دعائیں مانگیں مگر اسے یقین تھا کہ یہ قبول نہیں ہوں گی، اس لیے کہ اس کا دل منظور کا سا پاک دل کیسے ہوسکتا ہے۔

منظور اور اس کی جدائی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے بہت دکھ ہوتا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ صبح اس کو وہ چھوڑ کر چلا جائے گا اور اپنی نئی زندگی تعمیر کرنے میں مصروف ہو کر اسے اپنے دل و دماغ سے محو کردے گا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ منظور کی ”السلام علیکم“ سننے سے پہلے ہی مرجاتا۔ یہ نئی زندگی جو اس کی عطا کردہ تھی، وہ کس منہ سے اٹھا کر ہسپتال سے باہر لے جائے گا۔

سوچتے سوچتے اختر سوگیا۔ صبح دیر سے اٹھا۔ نرسیں وارڈ میں ادھر ادھر تیزی سے چل پھر رہی تھیں۔ کروٹ بدل کر اس نے منظور کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ اس پر اس کی بجائے ایک بوڑھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اختر پر سناٹا طاری ہوگیا۔ ایک نرس پاس سے گزر رہی تھی، اس سے اس نے قریب قریب چلّا کر پوچھا: ”منظور کہاں ہے“؟

نرس رکی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بڑے افسوسناک لہجے میں جواب دیا۔ ”بے چارہ! صبح ساڑھے پانچ بجے مرگیا“۔

یہ سن کر اختر کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے سمجھا کہ یہ آخری دورہ ہے......

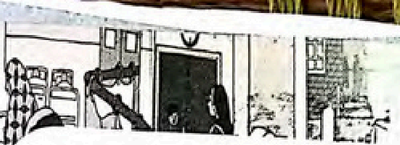

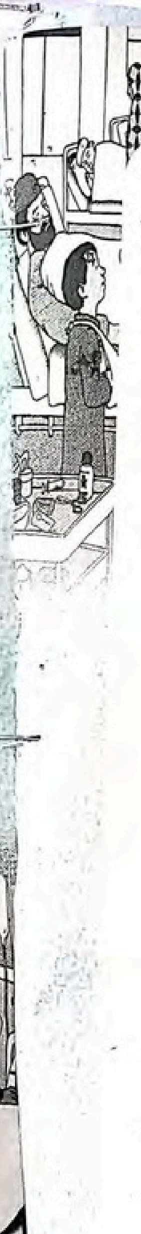

مگر اُس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اُسے ہسپتال سے رخصت ہونا پڑا۔

(منٹو کے بہترین افسانے)

مشق

۱۔ خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) اُس کے دل کی رفتار ______ تھی۔

(ب) مریض کو دل کا عارضہ ہے جسے ______ کہتے ہیں۔

(ج) وہ ہوش میں تھا اور اپنے ______ کا جائزہ لے سکتا تھا۔

(د) اُس نے ______ ہوئی آنکھوں سے منظور کی طرف دیکھا۔

(ہ) منظور کی ذات اُس کی نظر میں ______ کا درجہ رکھتی تھی۔

۲۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) اختر کو کس حالت میں ہسپتال لایا گیا؟

(ب) منظور کی بیماری کی وجہ کیا تھی؟

(ج) منظور ہسپتال سے گھر کیوں نہیں جانا چاہتا تھا؟

(د) اختر کے خیال میں اُس کے صحت مند ہونے کی کیا وجہ تھی؟

(ہ) ہسپتال کے اہلکاروں کا منظور سے کیسا رویّہ تھا؟

۳۔ منظور کے کردار پر ایک پیراگراف لکھیں۔

۴۔ اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۵۔ اس افسانے سے کم از کم ایسے پانچ جملوں کا انتخاب کریں جن میں امدادی افعال کا استعمال ہو۔

۶۔ اعراب لگائیں:

مفلوج، معجزہ، معین، مسیحا، مریض، مرض، مانند۔

۷۔ سرکاری ہسپتال میں داخل کسی مریض کی آپ بیتی لکھیں۔

۸۔ درج ذیل پیراگراف میں مناسب مقامات پر رموزِ اوقاف لگائیں۔

دورِ حاضر میں بجلی ایک خادمہ کی حیثیت رکھتی ہے گھروں کارخانوں اور دفتروں میں ہر جگہ یہ ہماری روزمرّہ زندگی کا لازمہ ہے بٹن دبایا پنکھا چل پڑا روشنی ہوگئی ہیٹر جل اُٹھا ائیر کنڈیشن نے کمرہ ٹھنڈا کر دیا ریفریجریٹر میں ہر چیز یخ بستہ ہوگئی کھانا تیار ہے کپڑے ڈھل گئے استری ہوگئی لفٹ نے آپ کو سیکڑوں فٹ بلندی پر پہنچا دیا غرض سوئچ دباتے ہی سب کچھ آن کی آن میں ہو جاتا ہے

۹۔ سبق کے مطابق جو جملے درست ہیں ان کے سامنے (✓) اور جو غلط ہیں ان کے سامنے (x) کا نشان لگائیں۔

ا۔ اختر کے بدن پر رعشہ طاری تھا۔

ب۔ اختر اور منظور ہم عمر تھے۔

ج۔ اختر کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول کی۔

د۔ منظور صحت یاب ہو کر گھر چلا گیا۔

ہ۔ کامیاب علاج نے ہی اختر کی بیماری ختم کی۔

و۔ منظور کی چارپائی پر ایک نحیف ونزار بوڑھا پڑا تھا۔

۱۰۔ تقریباً چارسو الفاظ پر مشتمل افسانہ لکھیں جس کا عنوان ایثار و قربانی ہو۔